

سائنس اور انجینئرنگ میں عورتوں کی کم نمائندگی

استحصا، امتیاز یا فطرت

پروفیسر لارنس ایچ سمرز^۱ / اخذ و تلخیص: سلیم منصور خالد

۱۴ جنوری ۲۰۰۵ء کو نیشنل بیورو آف اکنامک ریسرچ (NBER) امریکا کے تحت ایک قومی کانفرنس میں مسئلہ زیر بحث تھا: 'انجینئرنگ اور سائنس کے اعلیٰ اداروں میں اور اعلیٰ مناصب پر عورتوں کی نمائندگی'۔ امریکا کی درجہ اول کی دانش گاہ ہارورڈ یونیورسٹی کے صدر اور ممتاز ماہر معاشیات پروفیسر لارنس ایچ سمرز (Lawrence H. Summers) نے مسئلے کی نوعیت کو اپنے حسب ذیل خطبے میں واضح کرنا چاہا، جس پر امریکا کے طول و عرض میں حقوق نسواں کی لیڈر خواتین نے ان کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے کہ 'اسے برطرف کیا جائے، یہ عورتوں کو باورچی خانے میں دھکیلنا چاہتا ہے' وغیرہ وغیرہ۔ عورتوں اور مردوں کے فطری میدان کار کے خلاف لڑنے والے مغربی معاشرے میں فطرت کا یہ اعتراف پاکستان کے مغرب پرست فوجی حکمرانوں کی حکمت عملی کا بھی جواب ہے جس کے تحت کسی فطری مناسبت سے نہیں بلکہ مغربی دنیا سے بھی زیادہ روشن خیال بننے کے خبط میں وہ ہر جگہ خواتین کو آدھے یا تیسرے حصے پر فائز کرتے نظر آتے ہیں۔ حکمران تو اپنی پالیسیاں زیادہ تر سیاسی مصلحتوں کے تحت مرتب کرتے ہیں۔ لہذا ان سے قطع نظر پروفیسر سمرز کی یہ تقریر ہمارے ان دانشوروں کے لیے بھی لائق غور و فکر ہے جو خواتین کے دکھ درد کو سمجھتے ہیں اور ان کے بہی خواہ کی حیثیت سے دلی طور پر اس مسئلے کو حل کرنے کے آرزو مند ہیں۔ (س - م - خ)

زیر بحث مسئلے کے ایسے بہت سے پہلو ہیں جو قومی نقطہ نظر سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ تاہم میں اپنی بحث کو صرف اس دائرے تک محدود رکھوں گا کہ ہمارے ہاں درجہ اول کی

○ صدر ہارورڈ یونیورسٹی، کیمبرج، میساچوسٹس، امریکا

یونیورسٹیوں میں سائنس اور انجینئرنگ کے شعبہ ہائے تعلیم و تحقیق کی کلیدی اسامیوں پر عورتیں کیوں بڑی تعداد میں دکھائی نہیں دے رہیں۔ اس موضوع کو میں اس لیے زیر بحث نہیں لارہا ہوں کہ یونیورسٹی سطح کی تعلیم و تدریس میں یہ کوئی بڑا اہم مسئلہ ہے یا پھر کوئی بڑا دل چسپ موضوع ہے بلکہ گزارشات اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ جن اہم موضوعات پر میں خاصے عرصے سے سوچ بچار کرتا رہا ہوں، یہ ان میں سے ایک حساس موضوع ہے۔ طے شدہ نقطہ نظر کو پیش کرنے کے بجائے ہمیں زیر بحث معاملات کو کھلے ذہن سے دیکھنا چاہیے، کیوں کہ اسی کے نتیجے میں ہم صنفی مساوات کے ناقابل تردید نظریے کی ایک منصفانہ اور موزوں تعبیر و تشریح کر سکتے ہیں۔

مسئلہ صرف سائنس اور انجینئرنگ میں عورتوں کی کم نمائندگی کا نہیں ہے۔ ہم دیگر بہت سے شعبہ جات میں مختلف گروپوں کی کم نمائندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر: کیتھولک عیسائی، بنک کاری سرمایہ کاری کے میدان میں محدود تر ہیں حالانکہ ہمارے معاشرے میں یہ بہت زیادہ دولت پیدا کرنے والے شعبوں میں شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح ہماری قومی باسکٹ بال ٹیم میں گوری نسل کے کھلاڑی خال خال دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں سیاہ فام نسل کے کھلاڑی چھائے ہوئے ہیں لیکن ان کی صلاحیت کاری کی بنیاد پر کسی کورنگ و نسل کے حوالے سے اعتراض کا جواز نہیں ملتا۔ پھر زراعت اور فارمنگ کے شعبوں میں یہودیوں کی نمائندگی یا ان کا کردار نمایاں طور پر بہت تھوڑا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اور ان جیسے دیگر شعبہ ہائے زندگی میں کم نمائندگی کے مظاہر یا مثالوں کے اسباب کا تجزیہ کرنے کے لیے ہمیں ایک باقاعدہ نظام کار کے تحت طبی اور نفسیاتی تحقیقات کو بھی بنیاد بنا کر اصل حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

عورتوں کی واضح طور پر کم نمائندگی کے اسباب کا جائزہ تین وسیع تر مفروضوں کی بنیاد پر لیا جاسکتا ہے۔ قومی ادارہ معاشی تحقیقات کی کانفرنس کی دعوتی دستاویز میں ان کا ذکر چھیڑا گیا ہے۔ اس دستاویز سے پہلا یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ: غالباً سائنس، انجینئرنگ اور ٹکنالوجی نہایت اعلیٰ تنخواہوں کے شعبے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس کم نمائندگی میں غالباً خواتین کے رجحان طبع (aptitude) کو چیلنج کیا گیا ہے اور تیسرا یہ کہ کم نمائندگی دے کر سماجی سطح پر ذہین اور اعلیٰ درجے کی خواتین کا استحصال کرتے ہوئے انھیں صنفی امتیاز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

میں نے مختلف مواقع پر اس نوعیت کے بڑے نازک اور حساس موضوعات پر بڑی بڑی کارپوریشنوں کے اعلیٰ منتظمین سے عدل و انصاف کی فراہمی کے لیے کام کرنے والی بڑی وسیع کمپنیوں کے اعلیٰ شراکت داروں سے مشہور زمانہ تدریسی ہسپتالوں کے ڈائریکٹروں سے پیشہ ورانہ سروس فراہم کرنے والی بڑی بڑی تنظیموں کے قائدین سے اور اعلیٰ درجے میں تعلیم و تحقیق سے وابستہ اساتذہ دانش وروں اور تحقیق کاروں سے مسلسل تبادلہ خیال کیا ہے۔ ان تمام گروپوں سے مکالمے کے نتیجے میں بنیادی طور پر ایک ہی جیسی حیرت انگیز کہانی میرے سامنے آئی ہے۔

اب سے ۲۵ برس پہلے کی بات ہے سائنس اور انجینئرنگ کے شعبہ ہائے تدریس و تحقیق میں ہم نے بڑے پر جوش انداز سے اور دانستہ طور پر عورتوں کی نمائندگی خاصی بڑھائی۔ جن خواتین نے ۲۵ سال پہلے ان شعبہ جات سے وابستگی اختیار کی تھی، وہ اس وقت ۵۰، ۴۵ سال کے لگ بھگ ہوں گی۔ مگر اب ان شعبہ جات میں جا کر دیکھیں تو یہ صورت سامنے آتی ہے کہ وہ فاضل خواتین جن کے بارے میں بڑی توقعات قائم کی گئی تھیں، ان میں سے آدھی نہیں بلکہ آدھی سے بھی زیادہ تدریس و تحقیق کا یہ شعبہ چھوڑ کر چلی گئی ہیں اور جو موجود ہیں، وہ ان شعبہ جات میں عورتوں کی کم تر نمائندگی یا استحصال کی علامت قرار دی جا رہی ہیں۔ پھر اس میدان میں رک جانے والی ان فاضل خواتین میں بھی صورت یہ ہے کہ وہ غیر شادی شدہ ہیں یا پھر بچوں کے بغیر۔ یہ ہے حقیقت حال اور یہی بات اعلیٰ درجوں کے دوسرے متعدد پیشہ ورانہ اداروں میں خواتین کی کم تر نمائندگی کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں بہت سے پیشے اور لاتعداد ایسی باوقار سرگرمیاں ہیں جن میں کم و بیش ۴۰ سال کی عمر میں فرد بھر پور انداز سے قیادت اور رہنمائی کی جانب گام زن نظر آتا ہے۔ ہر ادارہ شعبہ یا خود کام، اس فرد سے یہی توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنے اوقات کار کا بڑا حصہ اپنے دفتر کو دے گا، کام سے دل بستگی کے باعث ہنگامی صورت حال میں بھی دفتری اوقات کے تقاضوں کو قربان نہیں کرے گا۔ اس اُبھرتے پر جوش لیڈر سے توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ فارغ اوقات میں بھی اسی مقصد کے لیے اور اس راہ میں پیش آمدہ مسائل و مشکلات پر قابو پانے کے لیے اپنے ذہن، فکر اور توجہات کو مرکوز رکھے گا، بلکہ اگر کسی وجہ سے اس کی ملازمت نہ بھی رہے تب بھی اس کی فکر کا محور یہی

کام ہوگا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ تاریخی طور پر ہمارے معاشرے میں ایک شادی شدہ عورت کے برعکس ایک شادی شدہ مرد اُوپر بیان کردہ پیشہ وارانہ وابستگی کے تقاضے کہیں زیادہ بہتر انداز میں نبھاتا ہے۔ اس نقطہ نظر کو یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ ان عورتوں کی تعداد کتنی ہے جو اپنی عمر کے ۲۰ سے ۳۰ سال کے حصے میں یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ وہ ہفتے میں ۸۰ گھنٹے کام کرنے والی ملازمت اختیار نہیں کریں گی اس کے مقابلے میں اسی عمر کے مردوں میں کتنے ہوں گے جو ۸۰ گھنٹے فی ہفتہ کام کرنے والی ملازمت اختیار کرنے سے انکار کریں گے؟ ان دونوں کے اعداد و شمار کا تقابل کریں تو حقیقت خود واضح ہو کر سامنے آجائے گی۔ تاہم ایک اہم سوال یہ بھی اٹھاؤں گا کہ کیا ہمارا معاشرہ یہ توقع رکھنے میں حق بجانب ہے کہ جو لوگ اہم عہدوں پر کام کر رہے ہیں وہ ۸۰ گھنٹے فی ہفتہ کام کریں۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مختلف نوعیت کے غیر متوازن رویے اپنانے اور نظریات گھڑ لینے کے بعد اس طرز پر سوچنا اور پھر اس پر چلنا خاصا مشکل ہو گیا ہے جسے میں غیر معمولی اہمیت دے رہا ہوں۔ وہ کون سا ایسا سبب ہے جس کے باعث سائنس اور انجینئرنگ کے شعبہ جات میں عورتیں دیگر شعبوں کی بہ نسبت کم تعداد میں فرائض انجام دے رہی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عورتوں اور مردوں کی تخلیقی صلاحیتوں میں خاصا فرق پایا جاتا ہے، مثلاً: قد و وزن، مجرمانہ ذہنیت، مجموعی طور پر ذہانت (I.Q.)، پھر ریاضیاتی اور سائنسی امور میں صلاحیت کار کا فرق ہمیں مردوں اور عورتوں میں صاف نظر آتا ہے۔ یہ فرق کسی وقتی حادثے کے طور پر ظاہر نہیں ہوئے بلکہ تمدنی اور ثقافتی طور پر ہزاروں سال سے ثابت شدہ ہیں۔

سائنس اور ریاضی میں دونوں اصناف (sexes) کے رجحان طبع، فطری مناسبت اور ذہانت کے معیار کو آپ جس بھی بہترین طریقے سے ناپیں گے، نتیجہ یہی نکلے گا کہ جہاں دو مرد ہوتے ہیں، وہاں ایک عورت پہنچتی ہے۔ کسی زیادہ بہتر طریقہ پیمائش کے ذریعے آپ اس مفروضے کو ہر پہلو سے جانچ پرکھ کر اگر کوئی دوسرا نتیجہ سامنے لاسکتے ہیں تو اس کا خیر مقدم کروں گا۔ جس چیز کو میں سائنس، انجینئرنگ اور اعلیٰ اختیاراتی ملازمتوں میں خواتین کی کم نمائندگی کا باعث سمجھتا ہوں،

کوئی آئے اور میرے اس نیچے فکر کی خامی اور سامنے نظر آنے والے نتائج کی غلطی کو ثابت کرے۔ سب سے اہم اور متنازعہ مسئلہ، جنسی امتیاز کے موضوع اور سمت کے گرد گھومتا ہے۔ یہ امتیازی رویہ واقعی کس قدر وسعت پذیر ہے؟ بلاشبہ بعض حوالوں سے جنسی امتیاز پایا جاتا ہے، جس میں اثر پذیری اور رواج پکڑنے کے روایتی گھسے پٹے رجحانات بھی ملتے ہیں۔ جس کے تحت لوگ، اپنی پسند کے لوگوں کو ذمہ داریوں پر بٹھاتے ہیں اور گوری نسل کے مرد اپنی ہی نسل کے مردوں کو ترجیح دے کر، نامناسب انداز سے آگے لاتے ہیں اور بسا اوقات ایسا اقدام شہ زوری کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یونیورسٹی سطح پر تدریس و تحقیق سے وابستہ لوگ اس مشاہدے کی تردید نہیں کر سکتے۔ افسوس کہ یہ رجحان آج بھی وسعت پذیر اور غالب ہے۔

دوسرا نکتہ ہے نسلی امتیاز کا، جسے ہم برسوں سے بھگت رہے ہیں۔ لیکن اس میں بھی ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کیا سبھی لوگ نسلی امتیاز کی بھینٹ چڑھ گئے یا کچھ لوگ اپنی خداداد قابلیت اور اعلیٰ درجے کی اضافی صلاحیتوں کے باعث اس بہت بڑی رکاوٹ کو بھی عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یقیناً اس سخت صورت حال کے باوجود جو مواقع ان اعلیٰ اداروں کی رنگارنگی (diversity) میں موجود تھے، جوہر خالص نے مضبوط قدموں سے اس میں اپنی جگہ بنالی اور علم، فن، تحقیق کے ذریعے انسانیت کو فائدہ پہنچایا۔ اگر واقعی علوم و فنون کی دنیا میں گہرائی تک سرایت کرنے والا تعصب و امتیاز پر مبنی نمونہ ہی موجود ہوتا تو کئی مؤثر رنگ دار امیدوار کبھی نہ آگے بڑھنے پاتے، اور نہ وہ اپنی زبردست صلاحیتوں کا لوہا منوا سکتے۔ اعلیٰ مناصب پر خواتین کی بڑی تعداد کے ہونے یا نہ ہونے کو جنسی امتیاز قرار دیتے وقت اس پہلو کو بھی ہمیں ذہن میں رکھنا چاہیے۔

ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اور اس نوعیت کے سوالات کا کیا جواب ہو؟ ہمیں جنسی یا نسلی امتیاز کی تقسیم سے بالاتر ہو کر یہ عمل کس طرح کرنا چاہیے۔ ہماری سوچ مثبت انداز سے ان پہلوؤں کو زیر بحث لائے تو یہ زیادہ ثمر بار ہوگا۔

اگرچہ ہمیں اقدام کرنے کی ضرورت ہے، لیکن قدم اٹھاتے وقت بڑے پیمانے پر احتیاط بھی کرنی چاہیے۔ یہ بات کہہ کر اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں کہ میں نے اپنی حد تک وسیع مطالعہ لٹریچر اور متعلقہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد سے تبادلہ خیال کی روشنی میں، دیانت داری سے بہترین قیاس

(guess) پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میری سب باتیں غلط ہوں۔ تاہم میں اسی وقت اپنے آپ کو کامیاب سمجھوں گا جب میری یہ گزارشات لوگوں کو جھنجھوڑ کر غور کرنے کے لیے بیدار کریں گی۔ ہم لوگوں کو بڑی دقت نظر سے ان معاملات پر غور کرنا چاہیے اور مسائل کو بے جا طور پر جذباتیت اور محض اشتعال کی کٹھالی میں ڈالنے کے بجائے بڑی سخت محنت اور احتیاط سے پرکھنا چاہیے۔ ایسے رویے سے ہماری اس جیسی کانفرنسیں کچھ نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہیں۔ (حوالہ:

(www.president-harvard.edu/speeches/2005)

حاشیہ: جب یہ بحث نقطہٴ عروج کو پہنچی تو سٹیو سیلر (Steve Sailer) نے ۲۰ فروری ۲۰۰۵ء کو انٹرنیٹ پر بحث کرتے ہوئے لکھا: ہمارے معاشرے میں مردوں اور عورتوں کے لیے تحقیق و تعلیم کے مساوی مواقع ہیں، لیکن عملاً نتائج دیکھیں تو دونوں اصناف مختلف نوعیت کے مظاہر سامنے لاتی ہیں۔ سائنسی علوم میں ٹھوس تحقیقی کارہائے نمایاں کی پیمائش کے لیے نوبل پرائز کے ریکارڈ پر نظر ڈالنے ہیں۔ ہر چند کہ پہلی شخصیت جس نے دو مرتبہ نوبل پرائز حاصل کیا وہ ایک عورت مادام کیوری (Curie) تھی، جس نے ۱۹۰۳ء میں فزکس اور ۱۹۱۱ء میں کیمسٹری کا پرائز حاصل کیا، لیکن اس کے بعد ۱۹۶۴ء تک فزکس اور کیمسٹری کے میدان میں کل پانچ خواتین نے نوبل پرائز لیا۔ بعد ازاں ان دونوں میدانوں میں ۱۶۰ سائنس دانوں نے نوبل پرائز حاصل کیے، جن میں عورتوں کا نمبر صفر ہے۔ میڈیکل سائنسز میں اگرچہ عورتوں کی کارکردگی تسلی بخش ہے، لیکن اس میدان میں خواتین عملاً ۲۳ نوبل پرائز حاصل کر سکیں۔ فیلڈ پرائز (Fields Prize) 'نوبل پرائز' جیسے مقام و مرتبے کا اعزاز ہے جو ریاضی (maths) میں اعلیٰ درجے کی صلاحیت کے حامل اسکالرز کی خدمات کے اعتراف میں دیا جاتا ہے، مگر آج تک کوئی عورت یہ ایوارڈ حاصل نہیں کر سکی۔ ۱۹۶۹ء سے اب تک معاشیات میں ۴۴ نوبل ایوارڈ دیے گئے ہیں، مگر ان میں سے ایک بھی عورت نہیں ہے۔ ہالی وڈ میں کہانی کار خواتین نہایت قلیل ہیں۔ بہترین فلم ڈائریکٹروں کو ۸۴ اکیڈمی ایوارڈ دیے گئے، جن میں صرف تین خواتین ہیں۔ سینما ٹوگرانی میں کسی عورت نے اکیڈمی ایوارڈ حاصل نہیں کیا، حالانکہ وہ بہت بڑی تعداد میں اس شعبے سے وابستہ ہیں۔ کام صلاحیت کار اور کمال کا باہم تعلق بھی ہے اور الگ سے وجود بھی۔ (ایک اور فرد نے لکھا دراصل تحریک آزادی نسواں کا ایجنڈا (فیمنسٹ ایجنڈا) واضح ہے اور وہ ہے حد سے بڑھا ہوا 'مرد مخالف' معاشرہ تشکیل دینا)۔